اشہر ہاشمی

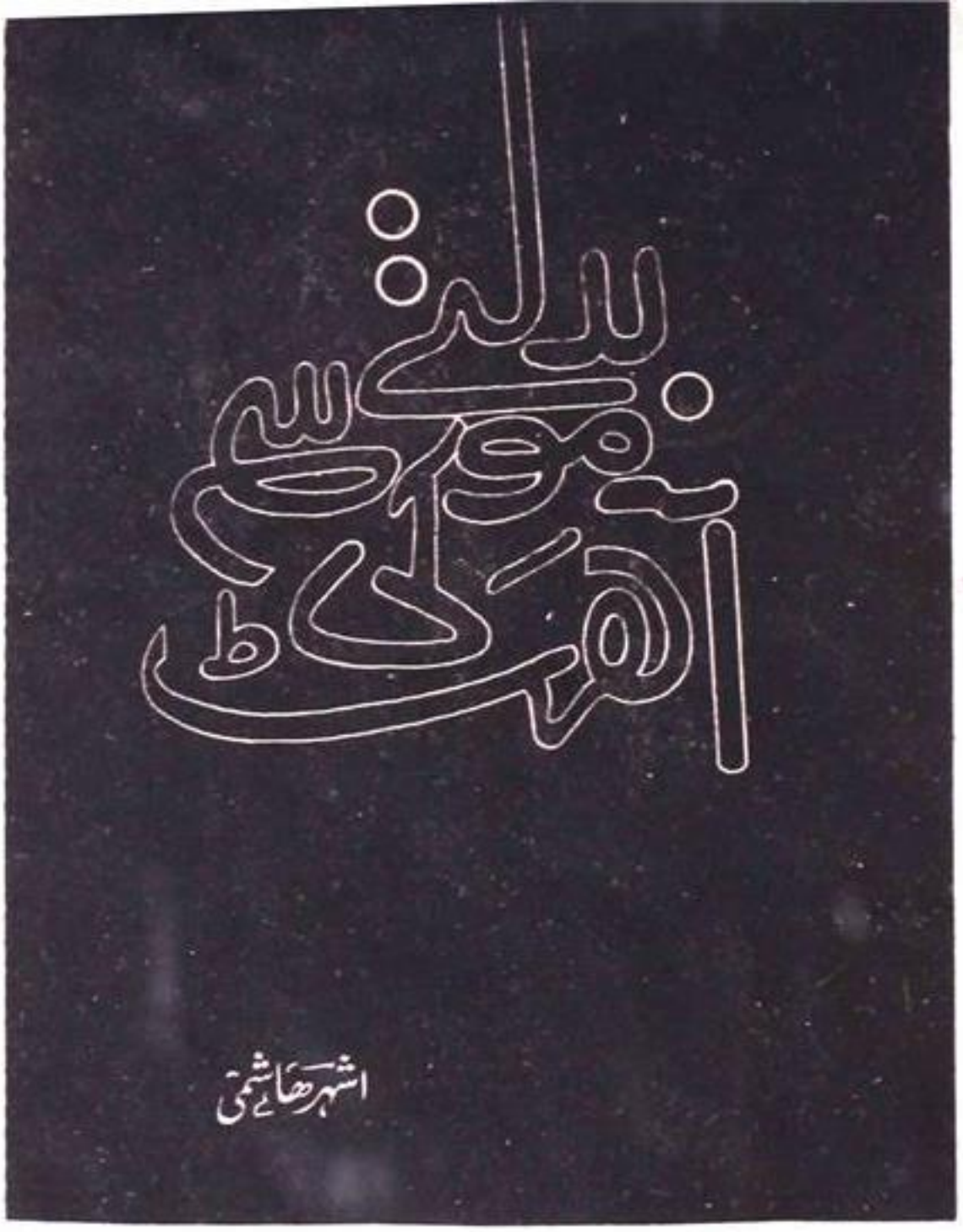

غزلوں کی ایک کتاب

اشہر ہاشمی کا پہلا شعری مجموعہ

رائٹرز سرکل ہوڑہ کے
اشاعتی سلسلے کی
پہلی کڑی

نام کتاب : ——— بدلتے موسم کی آہٹ
شاعر: ——— اشہر ہاشمی
پتہ : ——— ۳۱۔ روشن گلزار لین، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱
ناشر:۔ ——— رائٹرز سرکل ہوڑہ ۔ قیمت:۔ بائیس روپیہ
تعداد : ——— ۷۰۰
تاریخ اشاعت : ——— ۴۔ جنوری ۱۹۸۸ء
خوشنویس : ——— غلام مرتضیٰ ۶ نِل مادھب سین لین کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
مطبع : ——— آفسٹ پرنٹرس، ۳/۱۰۔ تال بگان لین، کلکتہ ۱۷
سرِورق : ——— احمد سلیم (ہوڑہ)

ملنے کے پتے :۔

(۱) رائٹرز سرکل ہوڑہ ۹ سری ناتھ پوریل لین، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱
(۲) آر ایم کیو رسنٹر۔ بلیلیس روڈ ہوڑہ ۔ ۱
(۳) بُک لینڈ۔ شب پور ٹرام ڈپو، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۲
(۴) جے ہند واچ کمپنی، اسٹیشن بازار روڈ، پوسٹ اور ضلع بردوان ۷۱۳۱۰۱
(۵) ڈاکٹر سید عتیق الرحمٰن باغ پاتو، پٹنہ سٹی ۸۰۰۰۰۸
(۶) سیّد محمود عالم تارنی پرساد لین، پٹنہ سٹی ۸۰۰۰۰۸
(۷) بُک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۴
(۸) مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸
(۹) سہ ماہی فکر و آگہی ایچ ۶۵ بی۔ سکٹر ۲۲۔ نوئیڈا۔ یوپی
(۱۰) شب خوں کتاب گھر ۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد ۔ ۳

بدلتے موسم کی آہٹ

اشہر ہاشمی

بدلتے موسم کی آہٹیں ہیں
فضاؤں میں گنگناہٹیں ہیں

شہر ہاشمی

ایک صفحہ
استادِ محترم
جناب قیصر شمیم کے لئے
جن کی شفقتیں مجھے گذشتہ ۲۵۔ سال سے حاصل ہیں۔

جو دل نہ سلگے تو مرجائے شاعری قیصر
بلائے جاں کی طرح یہ ہُنر کہاں کا ہے

بدلتے موسم کی آہٹ

آپ کے نام

○

زبانِ یارِ من

آج پھر جانِ من، سخت الجھن میں ہوں
اپنے شعروں کو میں نارسا دیکھ کر

جو تمہارے لئے ہیں مگر بے اثر
تم جو چاہو بھی تو پڑھ نہیں پاؤ گی
میرے شعروں میں رقصاں ہے میری زباں
مشفق و مہرباں نرم میٹھی زباں
جس کی تہذیب کا کوئی ثانی نہیں
تم پہ جو سخت ہے، تم کو آتی نہیں
اور جو تم پہ آسان ہے وہ زباں
ارضِ بنگال کے علم و دانش کی ماں

میری اپنی زباں جیسی شیریں زباں
مجھ پہ آساں بھی ہے، مجھ کو آتی بھی ہے
پھر بھی میرے لئے ایک مشکل ہے یہ
میں جو چاہوں بھی تو دوسرا پیرہن
اپنے اشعار کو دے نہیں پاؤں گا
آتے آتے ہی آتی ہے کوئی زباں
مدعا ہو نہ پائے گا میرا بیاں

اس لئے روحِ اشعار، جانِ ہُنر
آج پھر دیکھ لو، سخت الجھن میں ہوں
میرے شعروں کی تم تک رسائی نہیں
اور مرے شعر تم سے نہیں ہیں جُدا
ایک قربت عجب، اک عجب فاصلہ!

غزلیں

○

ہوں آوارہ تو زنجیری بنا دے
کسی کے خواب کا قیدی بنا دے

عطا کر لہلہاتی سبز شاخیں
مجھے گاتا ہوا پنچھی بنا دے

تری قدرت : جگا دے بختِ خفتہ
کہ مجھ کو اور بھی وحشی بنا دے

بڑھا دے آتشِ دل کی حرارت
ہوائیں اور برفیلی بنا دے

مرے کمرے میں ہے تصویر جس کی
اسے ان آنکھوں کی پتلی بنا دے

بسا دے پھر اسے اک بار یارب
دلِ برباد کو دلّی بنا دے

اُجلی پیلی کالی دھول
اندر باہر دھول ہی دھول

دیکھیں نکلے کون سوار
سامنے تو ہے اڑتی دھول

بھر کر بھیج لفافے میں
مجھ کو میرے شہر کی دھول

کاش! جمے پھر کپڑوں پر
وہ جانی پہچانی دھول

اس کی یاد کا جھونکا بھی
اوڑھے ہوئے ہے گہری دھول

آگ جو لی تھی تم سے قرض
اس پر جم گئی کیسی دھول

آنکھوں میں چنگاری ہے
ہے چہرے پر ہار کی دھول

بہہ گئے گھل کر پانی میں
تم بھی دھول تھے، ہم بھی دھول

اشہر ہاشمی دشتِ سفر
سناٹا، ویرانی، دھول

وہ اُٹھا داستان ٹوٹ گئی
تیر نکلا، کمان ٹوٹ گئی

جُھک کے داخل ہوا ترے گھر میں
سر بچایا تو آن ٹوٹ گئی

روکتی کیا پہاڑی جھرنوں کو
کھا کے جھٹکے چٹان ٹوٹ گئی

ہوتے ہوتے ادا ہوا جملہ
رفتہ رفتہ زبان ٹوٹ گئی

چیخ نے توڑ دی لبوں کی فصیل
پھر خموشی کی تان ٹوٹ گئی

اس کے آتے ہی غُل مچا رَن میں
صف اسی درمیان ٹوٹ گئی

پہچان زینے زینے کی طے کر کے آئے ہیں
ہم لے کے اپنے ہاتھوں میں آئینے آئے ہیں

جو گھاٹ پر کھڑے ہوں انھیں کیا پتہ کہ ہم
پانی میں نیچے نیچے کہاں بہتے آئے ہیں

شاید اب اس کے بعد خزانے پہ ہاتھ ہو
اب تک تو آگے کتنے ہی دروازے آئے ہیں

کاغذ پہ اس نے بھیجا ہے ہونٹوں کا ذائقہ
ممنون ہو کے میرے لئے بوسے آئے ہیں

ملہار گاتے گاتے سیہ بادلوں کے ساتھ
آجاؤ تم بھی، ڈالیوں پہ جھولے آئے ہیں

وہ ایک بار جن سے ملاقات ہو گئی
دیوانہ وار میری طرف کھنچتے آئے ہیں

شاید کہ آگئی ہے نئے رابطوں کی رُت
اشہر بلاوے کوئے تعلق سے آئے ہیں

○

جب چھوٹ چکے تھے تم، ہم راہِ سفر کیا تھا
لفظوں کی رفاقت تھی، جینے کا ہُنر کیا تھا

اک ٹوٹی ہوئی کشتی طوفان سے الجھی تھی
کیا کشتی کی ہستی تھی، کشتی کو خطر کیا تھا

اک شاخِ شگفتہ کی تصویر تھی آنکھوں میں
اس شاخ کا پس منظر اے دیدۂ تر کیا تھا

کیا رنگِ بغاوت تھا، کیا تابِ سعادت تھی
اک قطرہ لہو تھا دل، قطرے میں گہر کیا تھا

ان پیاسی زمینوں کو حیرت بھی ہے غصّہ بھی
کس زعم میں بادل تھے، قطروں پہ اثر کیا تھا

کیا ربط بڑھاتا میں، دعوت اسے کیا دیتا
کیا حیثیتِ دل تھی، کیا شوق تھا، گھر کیا تھا ؟

آنکھوں نے تو دیکھا تھا ہر عکسِ گُلِ تر کو
ہاتھوں کو یہ حیرت تھی لمسِ گلِ تر کیا تھا

زخمی تھے برابر کے، لیکن نہ کھُلا ہم پر
کس وار کی شدت کا کس جاں پہ اثر کیا تھا

امید تھی وابستہ ہر ایک کی مجھ سے ہی
بجھتی ہوئی آنکھوں میں، اک خاک بسر کیا تھا

سناٹا ہی سناٹا، تنہائی ہی تنہائی
دیواریں ہی دیواریں، کیا جانے کدھر کیا تھا

اشہر مری وحشت ہی توقیر کا باعث تھی
ورنہ مرے جیسوں کو لفظوں کا ہُنر کیا تھا

چاند روپوش، چاندنی موجود
گوشۂ دل میں روشنی موجود

نیرہ پیوست پشت اندر پشت
پہلو در پہلو اک انی موجود

چاند، سورج، زمین صف آرا
شہر میں ایک سنسنی موجود

اک تہی دست اور درِ آخر
در پہ اک قفل آہنی موجود

صبح۔ چہرے شگفتہ و شاداب
شام۔ چہروں پہ مردنی موجود

کوئے جاناں میں مجھ سا اک محتاج
پھر وہیں دل سا اک غنی موجود

شیشۂ دل بجھا بجھا اشہر
خُم بہ خُم سُرخ روشنی موجود

کوبہ کو دل نوازیاں موجود
یعنی یارانِ خوشدلاں موجود

برسرِ شہر گرم گیلی دھول
آسماں زیرِ آسماں موجود

کیا اماں گاہِ آرزو اپنی
متصل خانۂ زیاں موجود

پھر بھی تاریکیاں گھنی، گہری
جسم میں پانچ بتیاں موجود

خواب در خواب سلسلے اس کے
خواب در خواب جانِ جاں موجود

وسعتِ جاں میں خاک آوارہ
کوچۂ دل میں کارواں موجود

تیری غزلوں میں صرف عکس اشہر
میری غزلوں میں کہکشاں موجود

نقش در نقش اک صدا موجود
بے جرس جیسے قافلہ موجود

ایک پتھر ہر ایک پہلو میں
اور پتھر میں آئینہ موجود

پانیوں پر بھی نقشِ پا روشن
پتھروں میں بھی راستہ موجود

شاخ تا شاخ اہتمامِ گل
لب بہ لب گل کا مرثیہ موجود

آسمانوں پہ رنگ کے بادل
ان میں اک اجلی فاختہ موجود

حکم کے انتظار میں جنبش
سر پہ اک خنجرِ قضا موجود

ساتویں در کے بعد بھی اشہر
اک نہ اک در کا مرحلہ موجود

ایک افسانہ زیرِ لب موجود
زیرِ مژگاں خمارِ شب موجود

زندگی قتل گاہ اور سر پر
سایہ افگن نگاہِ رب موجود

بارگاہِ درشتگاں میں کوئی
مستقل مدعا بلب موجود

پھر وہی واجبات سے غفلت
پھر ملاقات کی طلب موجود

رونقیں تشنہ، زیب و زینت گم
وہ نہیں اور سب کے سب موجود

شہرِ آئندہ، شہرِ گم گشتہ
درمیاں شہرِ بے نسب موجود

کوئے لغزش کے سامنے اشہر
اک نگہہ دارِ خوش لقب موجود

ابتدا غائب، انتہا غائب
جزو موجود، سلسلہ غائب

منزلِ[1] جاہ، شام، بھاگرتی
دور تک دھول، قافلہ غائب

اک عمارت، ہزار دروازے
اور سایہ مکین کا غائب

ایک قطرہ لہو میں تر شجرہ
ایک خنجر میں سلسلہ غائب

شب ڈھلے سڑکیں لکھنؤ، پٹنہ
ریگِ تر دن، نقوشِ پا غائب

ایک کمرہ ہزار دیواریں
باہر آنے کا راستہ غائب

مرشد آباد! اک شکستہ بت
روبرو دھند، آئینہ غائب

۱؎ منزل THE PALACE، [illegible] ہزار دواری

رہ رہ کے خیال آئے سرِ شام کسی کا
ایسے بھی نہ چھینے کوئی آرام کسی کا

یاد آیا مرا شہر، مرے لوگ، مرا گھر
موصول ہوا جب مجھے پیغام کسی کا

یہ سوچ کے بہتوں کو جھڑکتا چلا آیا
منسوب مرے نام سے ہے نام کسی کا

کہتے ہیں کہ ہے میرا ہی وہ خانۂ ویراں
تکتا ہے جو رستہ سحر و شام کسی کا

اپنے سے بچھڑ جانے کی ساعت سے بھی گذرا
ہوتا ہے کہیں ایسا بھی انجام کسی کا

طے کر کے بہت لمبا سفر آیا ہے لیکن
اک اڑتی ہوئی دھول ہے انعام کسی کا

اشہر کے سوا، ساتھ لئے پھرتا ہے سب کو
اس شخص کو ہے خوف بہر گام کسی کا

ہے عجب سلسلہ اتفاقات کا
برخلافِ توقع ملاقات کا

تھا گھنا اور گہرا اندھیرا مگر
ہاتھ کو لمس ملتا رہا بات کا

اک عجب غیر مانوس آواز تھی
لفظ دیتے نہ تھے ساتھ جذبات کا

طے ہے جس وقت بھی یاد آجائے وہ
نور چھٹکائے گا چاندنی رات کا

انتہا پر بھی تھا اعتدال آشنا
دل تھا مرکز انوکھے تضادات کا

مجھ کو گھر کی طرف لوٹتا دیکھ کر
مُنہ اترنے لگا ہے قیاسات کا

مجھ سے یکطرفہ شوقِ رقابت میں وہ
جال کستا گیا خود پہ خدشات کا

کس سے قائم ہے اس شہر بھر م آج بھی
شہر کی اونگھتی ٹوٹتی رات کا

○

مری گرفت سے رہ رہ کے چھوٹ جاتی ہے
کسی کی ڈور ہی کچی ہے، ٹوٹ جاتی ہے

چراغ جلتے ہیں شب بھر کچھ ایسے یادوں کے
سفیدی صبح کی مشرق سے پھوٹ جاتی ہے

میں زندگی کا ثنا خواں بھی، شاکی بھی مگر
وہ نک چڑھی ہے کہ رہ رہ کے روٹھ جاتی ہے

نگاہ اٹھتی ہے اس رُوٹ کی ہر اک بس پر
تمہارے گھر کی طرف جو بھی رُوٹ جاتی ہے

مطابقت نہیں کر پائے گی کبھی اس سے
طبیعت اس کی طرف جھوٹ موٹ جاتی ہے

گو بساطِ نور و نکہت ہارنا
شخصیت کا بانکپن مت ہارنا

مجھ پہ جاری ہے یہ حکمِ شہریار
جیت کر بھی شہرِ حکمت ہارنا

کالی راتوں کا سفر اک سلسلہ
روز تاروں کی کھلی چھت ہارنا

آزمائش میں مری دیوانگی
راستے میں اس کا ہمت ہارنا

میری راتوں کی سیاہی سے کبھی
اے ستاروں کی ضیا، مت ہارنا

جانتا تھا میں مقدر ہے مرا
تیری دو دن کی رفاقت ہارنا

حق پرستی کیا ہے اشہر ہاشمی
تیغِ باطل کی حمایت ہارنا

راکھ کے اندر چنگاری ہے، یہ کیا جانتے ہم
خشک لبوں کا نم پلکوں سے رشتہ جانتے ہم

گاؤں، گلابی جاڑے، لڑکے، ناؤ، ندی اور دھوپ
ماہ و سال میں اس اک دن کو جینا جانتے ہم

برسوں کی دوری پر اب تک روشن ہے اک نام
لیکن اس تک جانے والا رستہ جانتے ہم

دونوں کی شامیں بے رونق ہیں، راتیں بے خواب
رُو در رُو اتنی سی بات جو کہنا جانتے ہم

اتنے پاس کہ سانسوں کی جھنکار سنائی دے
اتنے پاس چلے آنا ہے دھوکا جانتے ہم

اس کو ہم سے چھَن کر پار نکل جانے کا شوق
ہو جاتا ظاہر تو خود کو شیشہ جانتے ہم

اشہر تجھ سے ملنے کی ہے راہ نہ کوئی چاہ
لیکن تجھ کو بھول چکے ہیں اتنا جانتے ہم

یہ عُمر بہت ہے، یہ عنایت تو بہت ہے
مجھ کو تری دو دن کی رفاقت تو بہت ہے

دھڑکا ہے یہی آخری بس چھوٹ نہ جائے
میں راہ میں ہوں اور مسافت تو بہت ہے

وہ ہونٹ بھی ہے، آنکھ بھی ہے، ذہن بھی، دل بھی
اک سنگ سہی اس میں کرامت تو بہت ہے

تیرے بنا جینے کا سلیقہ بھی ہے، لیکن
جینے کے لئے تیری ضرورت تو بہت ہے

پلکوں پہ اتر آتے ہیں، اکتا کے افق سے
تاروں کو مری رات سے رغبت تو بہت ہے

اب جیسے کہ الفاظ کے معنی ہی نہیں ہیں
ورنہ مجھے اظہار پہ قدرت تو بہت ہے

بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گذر جاتی ہیں اشہر
ویران سی راتوں میں طوالت تو بہت ہے

○

راز ربطِ خاص کا کھُلنے لگا
میرا اس کا فاصلہ کھُلنے لگا

ہر طرف پانی تھا لیکن چل پڑے
پانیوں میں راستہ کھُلنے لگا

انکشافِ آمادگی ظاہر ہوئی
گرد اتری، آئینہ کھُلنے لگا

ہو گئیں آنکھوں سے آنکھیں آشنا
کیا پسِ دیوار تھا کھُلنے لگا

دھوپ لہرائی تو گیلی ریت پر
جانے کس کا نقشِ پا کھُلنے لگا

دست کش ہوتے کہ اشہرؔ ہاشمی
ہر درِ شہرِ دعا کھُلنے لگا

○

دعا کر، سبیلِ ملاقات نکلے
مرے ہاتھ میں پھر ترا ہاتھ نکلے

ہے ان میں کئی سال کی تھرتھراہٹ
ترے ساتھ جو چند لمحات نکلے

نئے ڈھنگ سے تجھ کو پہچانا دل نے
ترے بعد تیرے حکایات نکلے

تری جستجو میں جو اک شام نکلا
تہی دست سارے مقامات نکلے

میں اس شہر میں ان کا منکر تھا برسوں
ترے دَم سے جو اتفاقات نکلے

کئی لڑکیوں کے بدل جائیں تیور
کسی بزم میں گر تری بات نکلے

○

کسی کو پانے کی حسرت، نہ رنج کھونے کا
مجھے تو غم ہے ترے شہر میں نہ ہونے کا

تمہارا سر بھی ہے بھاری غبارِ نخوت سے
مجھے بھی نشّہ نہیں کم، کچھ اپنے ہونے کا

میں اپنے حصّے کی مٹّی کو معتبر جانوں
گمان گذرے گا، مجھ کو اسی پہ سونے کا

لیا کسی سے نہ احسانِ منزلت دل نے
مزاج خوب نرالا ہے اس کھلونے کا

گہر وہ لائے گا پانی پہ جس کو قدرت ہو
تماشہ ختم نہ کر ڈوبنے ڈبونے کا

خلل پڑے نہ کہیں شب ڈھلے عبادت میں
یہی تو وقت ہے اشہر، کسی کے رونے کا

طلسمِ رنگ، اعجازِ صدا، کیا کچھ نہیں تھا
سرِ منظر مگر لب پر کرشمہ کچھ نہیں تھا

وہ محرابِ انا میں گونجتا تھا بے تحاشہ
مگر محراب کے باہر تو گویا کچھ نہیں تھا

وہ میرا ہاتھ لے کر ہاتھ میں رونے لگی تھی
میں بُت تھا، دیکھتا سب کچھ تھا، کہتا کچھ نہیں تھا

کسی جاتے ہوئے منظر کے جلوے مرتسم تھے
تماشے میں مگر رنگِ تماشہ کچھ نہیں تھا

اسے میرے ملاقاتی مرا محبوب سمجھے
جو اک بے نام سا کردار میرا کچھ نہیں تھا

غزل میری مسیحا بھی، مری محبوب بھی تھی
علاجِ درد و بے خوابی، غزل سا کچھ نہیں تھا

مری شاخیں بھی اشہر ہاشمی جھکنے لگی تھیں
مجھے اس موسمِ رفتہ سے شکوہ کچھ نہیں تھا

○

جو قید ہیں ، وہ گذری ہوئی ساعتیں نکال
البم نکال ، گرد بھری فائلیں نکال

اپنی جبیں پہ تو نے بھی کج کر تو لی کلاہ
لیکن چلن میں اپنے مری لغزشیں نکال

برسوں کے بعد آئی ہے فرصت کی ایک شام
ملنے کی تجھ سے چاہ بھی ہے ، صورتیں نکال

میں بھی ترا حریف ہوں دیرینہ ہم نشیں
اب کھل کے اختلاف کی گنجائشیں نکال

مل جائیں گی کہیں بھی تجھے میری خامیاں
لیکن مرا ہُنر تو کسی اور میں نکال

○

برف اندازو شعلہ فشاں کب نہ تھا
فصل تا فصل تھا، آسماں کب نہ تھا

کب نہ تھی ایک پیلی دری چار سو
پھول پتّوں پہ جبرِ خزاں کب نہ تھا

سنگریزے نہ چبھتے تھے آنکھوں میں کب
شہر نظارہ نا مہرباں کب نہ تھا

کب مخالف نہ تھی میری سمتِ سفر
یہ سفینہ ہَوا پہ گراں کب نہ تھا

کب نہ تھا میرے پیروں میں چکر کوئی
شہر در شہر میرا نشاں کب نہ تھا

کب نہ تھا مضطرب اور نا مطمئن
موج تا موج آبِ رواں کب نہ تھا

رگِ تر پر تھا نقشِ کفِ پا اگر
نقش پر نقشِ موجِ زیاں کب نہ تھا

بھول کر نام نمبر بھٹکتا تھا میں
شہر میں ورنہ میرا مکاں کب نہ تھا

اک بڑے صنعتی شہر میں ہاشمی
برگِ آوارہ سا بے اماں کب نہ تھا

○

اور پُر اسرار سا، تہہ دار سا
دل ہوا منظر پسِ دیوار سا

تھی نہ للک تجھ سے ملاقات کی
کیوں ترا ملنا ہوا تیوہار سا

اس کی انا پاؤں کی زنجیر تھی
کوئی تھا گرتی ہوئی دیوار سا

پتیوں پہ بکھری ہوئی چاندنی
چاندنی میں ہر شجر اوتار سا

کیا ہو مری سرکشی پہ نکتہ چیں
مرد کوئی بندۂ دربار سا

خواب ہوا میرا لڑکپن ، مگر
سامنے ہے منظرِ بیدار سا

لغزشیں اس کی بڑی محتاط سی
اس کا چلن تھا مری گفتار سا

اڑتی ہوئی دھول میں ہر پل رواں
خواب کا چابک مرے رہوار سا

جھیل کے بدرنگ چمن میں کنول
میری طبیعت ، مرے کردار سا

دوستوں کے سامنے اشہر سپر
دشمنوں کے سامنے تلوار سا

○

مبارک ہوں تمہیں خیمے تمہارے
جدا ہیں راستے میرے تمہارے

دُکھی ہونا مقدر ہے تمہارا
بڑے ہیں قد سے آئینے تمہارے

مجھے پیار آیا ان پر بے تحاشہ
بڑے اچھے لگے بچے تمہارے

تمہیں اپنا لیا غیروں نے بڑھ کر
جو تنہا کر گئے اپنے تمہارے

کسی عنوان سے ہم بھی رہیں گے
جہاں بھی تذکرے ہوں گے تمہارے

نمائش دوسروں میں تھی زیادہ
مگر اشعار اچھے تھے تمہارے

○

طے رہا، غیرتِ آوارگی پر آئندہ
غیر آباد جزیرے کا سفر آئندہ

کٹتے ساحل پہ نہیں کوئی بھی منظر محفوظ
کیا ضمانت ہے نہ بھٹکے گی نظر آئندہ

خشک پتوں کا یہی ڈھیر غنیمت جانو
کیا پتہ رات ہو پھر کیسے بسر آئندہ

چند شاخوں پہ قناعت نہ کرے گا طوفاں
سر اٹھائیں نہ ہواؤں میں شجر آئندہ

میرے تلوؤں کی نمی سے نہ کبھی چمکے گی
وہ تری چھوڑی ہوئی راہ گذر آئندہ

○

بدلتے موسم کی آہٹیں ہیں
فضاؤں میں گنگناہٹیں ہیں

ہے اُس پہ غصّہ کہ خوف طاری
بدن پہ تو کپکپاہٹیں ہیں

ملایا تھا ہاتھ اس سے اک دن
ابھی تلک جھنجھناہٹیں ہیں

تمہیں ترستے تھے ، مل گئے تو
عجیب سی ہچکچاہٹیں ہیں

کوئی نیا خواب جاگتا ہے
پھر آنکھوں میں کسمساہٹیں ہیں

ہے کس کی آمد کا شور اشہر
چار سو بوکھلاہٹیں ہیں

○

مزاج اپنا موسم کا ہم رنگ نکلا
کبھی موم نکلا کبھی سنگ نکلا

کشادہ تھی پیشانیٔ شہر یاراں
مگر عرصۂ آرزو تنگ نکلا

قدم سوئے غائب بڑھائے ہوا نے
تو موجود پہلو سے بے رنگ نکلا

وہ اک بانکپن جو نہیں ہارنا ہے
اسی پہ میں آمادۂ جنگ نکلا

طبیعت کئی روز سے مضمحل تھی
غزل جب مکمل ہوئی رنگ نکلا
تقاضے مری بے نیازی کے تھے کچھ
رویّہ بھی اشہر ہم آہنگ نکلا

○

پچھلی رُت کی داستانیں یہ ہوا لے جائے گی
زرد پتّوں کی دری اب کے اڑا لے جائے گی

ٹوٹ کر گرتے ہوئے پیڑوں سے بیج نکلا ہوں میں
کیا پتہ اب کن وبالوں میں ہوا لے جائے گی

برف پگھلے تو نکل آئے گی اک بہتی لکیر
جو ڈھلانوں کی طرف مجھ کو بہا لے جائے گی

دوستوں کے بیچ جب ہو شام اک بے کیف شام
تلخ کر لو گفتگو، تلخی بچا لے جائے گی

کر کے جب انکار لوٹ آؤ گے اشہر ہاشمی
اعترافِ جرم کی جانب خطا لے جائے گی

○

بے آب، بے گیاہ ہیں دشتِ سوال سب
برسا ہے ابر بھول کے اپنے کمال سب

اس کے بدن کی بوئے معطّر مگر کہاں
جس کے لئے سمیٹے ہیں میں نے وبال سب

ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا سا ہوتا ہے منکشف
جیتا ہے اپنے طور سے وہ ماہ و سال سب

کن ٹھنڈے میٹھے سبز مناظر کی کھوج میں
نکلے ہیں گھر سے چھوڑ کے اہل و عیال سب

یہ فصلِ زرد شاخوں سے اترے کسی طرح
مرجھا رہے ہیں شہر میں نخل و نہال سب

○

اجنبی تھا جو، وہی میرا شناسا نکلا
شہر کی بھیڑ میں اک شخص تو اپنا نکلا

مجھ کو پہچان لیا پہلی نظر میں اس نے
وہ مرے جاننے والوں میں اکیلا نکلا

چھٹ گئی دھول کی تہہ دل پہ بنے نقشوں سے
کیسا اک جھونکا کسی تیز ہوا کا نکلا

سارے گوشے ہوئے کمرے کے منوّر اشہر
اس کا آنا مری تکمیل کا لمحہ نکلا

○

○

سب کی تھی پہچان مجھ کو اپنی ہی نہ تھی
آئینوں سے بیر تھا، رُخ پر نظر جاتی نہ تھی

میں بھی چل سکتا ہوں پانی پر گماں گذرا نہ تھا
مجھ کو بھی لہروں پہ قدرت ہے یہ خوش فہمی نہ تھی

پہلے دن بارش میں بھیگا کیسی محرومی کے ساتھ
بھیگنے کی آرزو تھی ہاتھ میں چھتری نہ تھی

پٹریاں تھیں، پُل تھے یا تجدید راہِ شوق کی
میرے اس کے درمیاں کس حال میں دوری نہ تھی

شہر میں اس کے علاوہ بھی تھے کتنے کج کلاہ
ایک اشہر ہاشمی سے کیوں مری بنتی نہ تھی

○

حال یہ ہوا کس کے انتظار میں اس کا
ریت ریت چہرہ تھا، ریگ زار میں اس کا

عکس بہتے پانی پر ٹوٹ جانا بن بن کے
آئینہ ہے اس عہدِ انتشار میں اس کا

نم تھی میری اور اس کی دونوں ہی کی پیشانی
سامنا ہوا جب جب رہ گذار میں اس کا

اور تھوڑی شدت سے اس کی کھوج کی میں نے
سایہ جب ملا مجھ کو خواب زار میں اس کا

سرحدِ تعلق سے جو نکل گیا اشہر
تذکرہ نہیں کرتے کوئے یار میں اس کا

○

خزاں رسیدہ امنگوں کے درمیاں رہنا
نصیبِ شوق میں آیا ہے نیم جاں رہنا

بدن کے زندہ تقاضوں کے بس سے باہر ہے
تمہارے اتنے قریب آکے بے زباں رہنا

پھر اس کے بعد جب اس شہر میں کبھی آجاؤ
اک آدھ دن کے لئے میرے میہماں رہنا

مرے جنون کی تجدید کرتا رہتا ہے
ہوا کا خوشبو لئے کو بکو رواں رہنا

نیا نہیں یہ رویّہ مرے تعلق سے
کسی رفیق کا مشکوک و بدگماں رہنا

یہ تجربہ ہے تو دانتوں پسینے آئیں گے
نہیں ہے سہل کسی سے کشاں کشاں رہنا

○

آئے بے درد جھونکے، اڑا لے گئے
میری پہچان کے سب حوالے گئے

بے قبا ہوگئیں سب بھری ڈالیاں
سارے برگ و ثمر توڑ ڈالے گئے

طے ہوا کتنی پگڈنڈیوں کا سفر
کتنے بے قابو گھوڑے سنبھالے گئے

تھے جو لمحے ترے لمس سے آشنا
سب بدن کے تقاضے چُرا لے گئے

گھر سے، احباب سے، ذات سے، خواب سے
اک اچٹتا تعلق نبھالے گئے

○

میں اپنا چہرہ بدل لوں ، کہ آئینہ بدلوں
کہاں سے زاویہ فکر و نگاہ کا بدلوں

تمام رات اٹھائے ہوئے میں دستِ دعا
یہ سوچتا ہی رہا لہجۂ دعا بدلوں

میں دے رہا ہوں تغافل کو راہ دانستہ
کہ بھیڑ آگے بڑھے اور راستہ بدلوں

یہ کشمکش کی فضا، امن ہے نہ جنگ کھلی
چلے بھی آؤ مقابل کہ مرحلہ بدلوں

ہے روز اس سے ملاقات لازمی اشہر
اب اپنا وقت بدل دوں کہ راستہ بدلوں

○

ہوں ترکِ تعلق کے بیابان میں تنہا
بپھرے ہوئے طوفان میں، ہیجان میں تنہا

تجدیدِ تعارف کی نہیں کوئی ضرورت
اب رہنے دے مجھ کو مری پہچان میں تنہا

وہ آخری خیمہ بھی ملاقات کا اکھڑا
پھیلی رہیں شامیں کھلے میدان میں تنہا

دم گھٹنے لگا رات تو کمرے سے نکل کر
پہروں یونہی بیٹھا رہا دالان میں تنہا

پھیلی ہوئی شاخوں پہ عجب حشر بپا ہے
ہے نخلِ بدن لمس کے طوفان میں تنہا

وہ شہر مرا، لوگ مرے چھوٹے ہیں لیکن
اس شہر میں کہاں ہوں کسی عنوان میں تنہا

○

مجھ کو اشہر مصلحت آتی نہ تھی
میرے سر پر اس کی چھت آتی نہ تھی

میں نے توڑا تو نہ تھا کاغذ کا پُل
کیوں کسی کی خیریت آتی نہ تھی

اک گھٹن طاری تھی ہم پہ جتنے دن
جنگلوں کی شہریت آتی نہ تھی

جستجو بھٹکا رہی تھی ہر طرف
خوشبوؤں کی سلطنت آتی نہ تھی

ہوش مندوں کی کسی فہرست میں
ایک پاگل شخصیت آتی نہ تھی

نت نئے کھلتے تھے کالے مورچے
نصرت و نورانیت آتی نہ تھی

کتنے پانی میں تھا، وہ کس قدر کا تھا
کھل کے اس کی حیثیت آتی نہ تھی

چاندنی راتیں میسّر تھیں مگر!
وہ نشیلی کیفیت آتی نہ تھی

کھٹکھٹاتی تھی درِ غیظ و غضب
رات سوئے ماسیت آتی نہ تھی

نہ پاکیزہ ، نہ آلودہ رہا ہوں
میں پانی میں کھڑا پیاسا رہا ہوں

بھٹکتی ، بھاگتی کاروں سے بچتا
میں چوراہے پہ بھی تنہا رہا ہوں

خبر کیا دن بجھا ، یا رات چمکی
میں اس کمرے میں قیدی سا رہا ہوں

ملو آواز کی لہروں پہ شاید
"بزر" بجتے ہی چونکتا رہا ہوں

برس گذرے نہ دیکھی اس کی صورت
طلب میں جس کی آوارہ رہا ہوں

ہے اک بن باس ہم سب کا مقدر
میں بنجاروں میں گاتا جا رہا ہوں

کسی بے نام سے رشتے کو اشہر
میں یکطرفہ نبھاتا جا رہا ہوں

○

میری آنکھوں میں کوئی خواب اکیلا، حیراں
جھیل میں جیسے کہ مہتاب اکیلا، حیراں

موجِ آوارہ سفینے کی طرفدار ہوئی
دیکھتا رہ گیا گرداب اکیلا، حیراں

غیر مانوس رویّوں کا امیں آج بھی ہے
دل جو پہلو میں ہے بیتاب اکیلا، حیراں

درد کے اور بھی افسانے ہیں تشہیر طلب
پر ترے نام کا اک باب اکیلا، حیراں

رونقِ بزم تھا تہہ دار خموشی سے اٹھا
چھوڑ کر حلقۂ احباب اکیلا، حیراں

لوٹ آئیں مری بیزار نگاہیں اشہر
رہ گیا منظرِ شاداب اکیلا، حیراں

دفعتاً جو ہوئی، بات اچھی لگی
بے ارادہ ملاقات اچھی لگی

زرد سیال سی دھوپ تھی چار سو
غیر موسم میں برسات اچھی لگی

آنکھ بھیگی ہوئی، لب لرزتے ہوئے
یہ ادائے شکایات اچھی لگی

وقتِ رخصت یہ پوچھا کہ آئیں گے کب
ایک ننھے کی یہ بات اچھی لگی

دامنِ احتیاط اس سے چھوٹا مگر
لغزشِ شوق و جذبات اچھی لگی

دور تک کھیت تھے اور پگڈنڈیاں
گاؤں میں چاندنی رات اچھی لگی

بند پلکوں کے پیچھے بھی اشہر مجھے
اس کے جلووں کی بارات اچھی لگی

○

ریت میں لہر آکر، جذب ہو جانے والی
جذب ہو جانے والی، یعنی کھو جانے والی

دور تک اک سمندر، غرق کر دینے والا
بے خطر ایک کشتی، غرق ہو جانے والی

ساتھ میرے بھٹک کر، میری باہنوں میں تھک کر
ایک معصوم خواہش، روز سو جانے والی

اک تماشا یہاں کی موسمی ندّیوں کا
چند آوارہ موجیں، گھر ڈبو جانے والی

روبرو آنکھ نیچی، رو برو جسم لرزاں
روبرو اِک قیامت، زیر ہو جانے والی

ریت سا زرد چہرہ، تشنہ تنہا تسلسل
اور یادوں کی شبنم، لب بھگو جانے والی

اک اضطراب دشمنِ خیمہ زنی رہا
شرمندۂ قیام نہ ہو پایا قافلا

شمشیر لوٹ ہی گئی واپس نیام میں
دشمن سے رشتہ خون کا بھی دودھ کا بھی تھا۔

کچھ ایسا ہوگیا مرا برتاؤ اس کے ساتھ
جیسے کہ اجنبی سے کوئی اجنبی ملا

گوشہ نشیں بھی ہوکے رہے تذکروں میں ہم
تھا اس طرح وجود عدم میں رچا بسا

اک ڈور تھی جو ٹوٹ گئی بیچ میں کہیں
اب اس کے میرے بیچ نہیں کوئی رابطہ

موسم وہی ہے، وقت وہی ہے، جگہ وہی۔
لیکن کہاں وہ منظرِ رفتہ پلٹ سکا

ہم تم وہی ہیں، وقت وہی ہے، جگہ وہی
لیکن کہاں سے موسمِ رفتہ وہ آئے گا

○

اشہر! کہاں وہ شخص کہ اپنا کہیں جسے
ہم ڈھونڈتے ہیں شہر میں تجھ سا کہیں جسے

اپنا بھی دل اسی کی طرح سربلند ہے
مٹیالے پانیوں میں شگفتہ کہیں جسے

تنہا رہوں تو ہونٹوں پہ رہتا ہے جلوہ گر
وہ اضطرابِ قلب کہ نغمہ کہیں جسے

کوئی تو ہے کہ جس کا اسے انتظار ہے
ہر گام بھیڑ میں بھی اکیلا کہیں جسے

ہر دم صدائیں دیتا ہے اک فاصلے سے وہ
ہم اپنی آرزو کا مسیحا کہیں جسے

منظر دکھا گئے مرے احباب کون سا
بے ساختہ کمالِ تماشہ کہیں جسے

○

نہ اضطراب نیا ہے، نہ حادثہ ہے نیا
ہمارا دل ہی مگر آج بن گیا ہے نیا

ہر ایک موسمِ دل سہل تھا مجھے، لیکن
یہ روز و شب کے تعطل کا مرحلہ ہے نیا

یہ سلسلہ ترے ملنے کا ہے نیا ورنہ
نہ میں نیا ہوں نہ تو ہے نہ راستہ ہے نیا

مرا جنوں، مری آوارگی، مرا غصّہ
کتابِ درد میں اک باب کھل رہا ہے نیا

سلگتا آیا ہوں میں ایک آنچ میں لیکن
کسی کے ساتھ پگھلنے کا ذائقہ ہے نیا

کچھ ایسا لگتا ہے پہلے بھی مجھ پہ گذرا ہو
مجھے یقیں بھی ہے اس کا کہ واقعہ ہے نیا

○

اب اس سے اپنی دوستی یا دشمنی رہے
اک سلسلے کی بات ہے جیسے بنی رہے

آ، دیکھیں کون کاٹ کے لاتا ہے جوئے شیر
اس سنگلاخ دشت میں تیشہ زنی رہے

سائے کو کر ہی دیتی ہے زخمی ہتیلی دھوپ
پتوّں کی چھاؤں پیڑ پہ چاہے گھنی رہے

ہر لمحہ ایک خطرہ ہو محسوس اس کو بھی
شمشیر اس کے سر پہ بھی ہر دم تنی رہے

بڑھ کر مصافحہ بھی تو کرنے کی دل میں ٹھان
یہ کیا کہ اک حریف سے یونہی ٹھنی رہے

خواب سا خواب تھا منظر اس کا
میری جانب نہ ہوا سر اس کا

اس کا آنا، مرا جانا نہ ہوا
ویسے بھی دور نہ تھا گھر اس کا

اور شفاف و شگفتہ دیکھا
اب کے آنکھوں نے گلِ تر اس کا

وہ سڑک پر کہ پیڑوں میں ملے
دل ہے ہر حال میں خوگر اس کا

شہر میں آ گئی رونق اس سے
لیکن اس دل میں جو تھا گھر اس کا؟

خواب آنکھوں میں ہے، سودا سر میں
اور ان پیروں میں چکّر اس کا

میں نے تاروں کی رفاقت پائی
دیکھ کر روئے منوّر اس کا

یوں تو گمنام تھا اک شہر لیکن
تذکرہ تم سے ہے گھر گھر اس کا

○

نہ زلف اس کی پریشاں، نہ خشک لب اس کے
ہوئے نہیں طرب انگیز روز و شب اس کے

وہ بن سنور کے ملا عام آدمیوں سا
مرے جنوں کو نہ آئے پسند ڈھب اس کے

مجھے گرفت میں لے بن کے میرے ہی جیسا
وہ خود کسی کا نہ ہو اور سب کے سب اس کے

ابھی نہیں ہے مری ہمسری کے قابل وہ
حریف ہوتے نہیں لوگ بے سبب اس کے

اگر ہمارا وفادار وہ نہیں نکلا
تو ہم بھی لوٹ کے اشہر ہوئے تھے کب اس کے

لائی آندھی قیامتیں کتنی
ٹوٹ کر گر گئیں چھتیں کتنی

خامشی، سوچ، بے دلی، الگاؤ
ایک میں ہوں علالتیں کتنی

کیا ہوا ترک ملنا یاروں سے
چھوٹ جاتی ہیں عادتیں کتنی

سخت پیچیدہ مسئلوں سی ہیں
چھوٹی چھوٹی ضرورتیں کتنی

مجھ سے منسوب ہوتی رہتی ہیں
الٹی سیدھی حکایتیں کتنی

تم بھی جھوٹوں میں بیٹھ کر دیکھو
سچ پہ کرتے ہیں حجتیں کتنی

کھول دوں میں جو کھڑکیاں اشہر
گھیرنے آئیں نکہتیں کتنی

○

مرے افق پہ نیا چاند بن کے آؤ تم
سیاہ رات کے آنچل سے چھن کے آؤ تم

ہے شام چہرے پہ چہرہ جھکائے رکھنے کی
طیور گاتے ہیں دو ہے ملن کے، آؤ تم

ہے کاروبار زمانہ ابھی تعطّل میں
بجھے ہوئے ہیں چراغ انجمن کے، آؤ تم

بدن کا لمس ضروری نہیں ہے روحِ سکوں
کبھی صدا، کبھی تحریر بن کے آؤ، تم

○

زمین ہلتی ہوئی، آسمان گرتا ہوا
مری نگاہ میں ہے اک مکان گرتا ہوا

یہ اک طلسمِ نشیب و فراز بھی کچھ ہے
تمہیں دکھائیگا سارا جہان گرتا ہوا

ہوا اترنے لگی ہے کھلے سمندر میں
اکیلی کشتی ہے اور بادبان گرتا ہوا

ہے انتشار میں خود ساختہ امیر کی فوج
سنبھالے کون اب اس کا نشان گرتا ہوا

اِدھر یہ زخمی درندہ ہے جست آمادہ
اُدھر لرزتا شکاری، مچان گرتا ہوا

تو اپنی محفلِ شب میں کبھی بُلا مجھ کو
بدن کے زندہ طلسمات بھی دکھا مجھ کو

ہوئے نہ محو نشیب و فراز کے قصّے
کہ تلخ یادوں کا ہر وقت ہے نشہ مجھ کو

یہ سربلندی بھی بے کیف ہوتی جاتی ہے
اب اپنے قدموں سے اک روز روند جا مجھ کو

میں گہرے پانی کی تہہ میں اُتر چکا کب کا
کسے پتہ کوئی دیتا بھی ہے صدا مجھ کو

مرے حریف کی تجسیم کا بھی ساماں کر
مرے ہی غیظ سے اب خوف مت دلا مجھ کو

پتہ نہیں مری وحشت کو کھوج ہے کس کی
مرے تمام شناساؤں سے ملا مجھ کو

میں بد مزاج، اجڈ، غیر مجلسی، جاہل
کچھ اور اس کے سوا بھی ہوں تو بتا مجھ کو

○

یہ عجیب سلسلہ ہے کہ ہر اک بساط ہاریں
کہیں ہار آئیں صورت کہیں ہم صفات ہاریں

یہ کمالِ گمرہی تو مرے سامنے رہا ہے
کہ سفر میں رہنے والے شجرِ نجات ہاریں

انھیں بخش دیں صداقت کہ جو تہمتیں ہیں سر پر
کریں ارتکابِ لغزش، شبِ احتیاط ہاریں

مری سیڑھیوں کے نیچے رہیں سانپ چاہے جتنے
مری سیڑھیوں پہ چڑھ کر مگر اپنے دانت ہاریں

نئی سمت ڈھونڈتے ہیں تو نہ ہم سے ہوگا اشہر
کہ محاذِ جستجو پر صفِ ممکنات ہاریں

○

بلند خوابوں سے رکھ پائے تال میل کہاں
خمیدہ پشت کے قابو میں ایسے کھیل کہاں

کسی بھی گاؤں کے نزدیک کھینچ لو زنجیر
یہ فکر کیوں ہے کہ رکتی ہے جا کے ریل کہاں

ہزار سیڑھیاں، سمتیں اس اک حصار میں ہیں
جو خود میں دشتِ سفر ہو، بدن سی جیل کہاں

تمہارے شہر میں ہر چیز پُرکشش ہے مگر
جو پھیلے پھوس کے چھپّر پہ ایسی بیل کہاں

میں لمحہ لمحہ رہا زندگی کے ساتھ، مگر
تباہ حالوں سے ملتی ہے یہ چڑیل کہاں

○

نہ خود فریبی کا قائل ، نہ مطمئن خود سے
اس اضطراب کے دیکھے ہیں میں نے دن خود سے

میں اپنے آپ میں وحشت کی انتہا پر ہوں
چبھوتا رہتا ہوں ناخن میں آلپین خود سے

پھر اپنا جسم بھنبھوڑے گا، خون چوسے گا
چنگھاڑتا ہوا لپٹے گا ایک جن خود سے

چھپائے رکھو غلاظت کو فلسفوں میں ذرا
کسی مقام پہ آنے لگے جو گھن خود سے

بپھر کے روکنے آتے ہیں راستہ میرا
فریب کھاتے رہے تھے جو سال و سن خود سے

○

بے قدم آہٹوں میں تنہا ہوں
سرد غرّا ہٹوں میں تنہا ہوں

کنڈیاں ، ہاتھ ، گونج ، بند کواڑ
ان گنت چوکھٹوں میں تنہا ہوں

جاں بلب کر رہی ہے پیاس مجھے
گاؤں کے پنگھٹوں میں تنہا ہوں

جل رہی ہیں چتائیں خوابوں کی
اور میں مرگھٹوں میں تنہا ہوں

سب گئے چھٹیوں میں گھر اپنے
صرف میں آہٹوں میں تنہا ہوں

○

ایک بے نام اُداسی کی فصیلیں یا میں
ذہن میں اُتری ہوئی آہنی کیلیں یا میں

اک تعطّل کی فضا سر پہ افق تا بہ افق
تم سے جا ملنے کی سب بند سبیلیں یا میں

مسکراتی ہوئی آنکھوں میں اداسی کی پرت
دھوپ اور چھاؤں کی بے جان دلیلیں یا میں

ایک لا ختم سفر، پیاس کی شدت، صحرا
سر پہ لہراتی ہوئی چیختی چیلیں یا میں

کوئی منظر ہے نہ آواز ہی کوئی اشہر
سامنے چلتی ہوئی کھوکھلی ریلیں یا میں

○

نجات کیسی، کئی باتیں اور ہونی ہیں
پھر اپنی اپنی بھری کشتیاں ڈبونی ہیں

ابھی تو باقی ہیں اعزاز کے امور کئی
لہو سے اپنے ہمیں پوششیں بھگونی ہیں

تلاش کیجئے دریا ہزار سال کہیں
ابھی تو نیکیاں شانوں پہ اپنے ڈھونی ہیں

ہزار ہاتھوں کی مصروفیت نہ چھوڑے گی
یہ چھٹیاں بھی انھیں بستیوں میں کھونی ہیں

یہ خواب کا عالم یقین کرنا ہے
بدن میں اپنے ہمیں سوئیاں چبھونی ہے

○

کسی کے لئے اجنبی ہوں، کسی کا شناسا رہا ہوں
شناسائی یا اجنبیّت، میں ہر حال میں مبتلا ہوں

اکیلا سفر ریل کا تھا، اندھیرے بڑھے آ رہے تھے
اچانک صدا چاند نے دی، ترے ساتھ میں چل رہا ہوں

جنوں کی ہے یہ کون منزل کہ میں ریل کی پٹریوں سے
لگائے ہوئے کان اپنے، کئی آہٹیں سُن رہا ہوں

ہے بکھراؤ پہچان میری، مرا کیسا بننا سنورنا
میں کیوں گھر سے بن ٹھن کے نکلوں، کسی سے جو ملنے چلا ہوں

فقیری میں اِک بانکپن ہے، کسی سے نہ لینا نہ دینا
کہاں خاکِ پا میں کسی کی، میں اپنی جگہ ڈھونڈتا ہوں

کبھی ہلکی ہلکی سی بارش، بھگونے کو آئے مجھے بھی
میں کچھ اس تکلف سے بھیگوں، کہ جیسے میں بچنے چلا ہوں

تمہیں میری وارفتگی سے، کبھی کوئی شکوہ نہ ہوگا
مزاج اپنے احباب کا میں، قرینے سے پہچانتا ہوں

کہیں ذکر لہجے کا اشہرؔ، کہیں میرے اسلوب کا ہے
غزل میں مری حیثیت کیا، مگر دوسروں سے جُدا ہوں

○

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
یہ کائنات نئی ہے، مگر مری دنیا؟

یہی کہ چشم زدن میں ہوا میں کچھ سے کچھ
یہی کہ چشم زدن میں بدل گئی دنیا

مجھے یہ فکر کہ ٹوٹے نہ حوصلہ اس کا
اسے یہ ضد کہ مٹا ڈالے وہ مری دنیا

نہ اس کے دل میں بڑاپن، نہ ذہن میں وسعت
بہت ہی چھوٹی تھی میرے عزیز کی دنیا

بڑھی ضرور مگر لڑکھڑاتے قدموں سے
نئی صدی کی طرف کانپتی ہوئی دنیا

نہ درد ہے نہ مروت نہ گرمجوشی ہے
کہ آدمی کو مشینی بنا چکی دنیا

نفس بے طلب، ضمیر مطمئن
خستگی میں ہے فقیر مطمئن

شاخ شاخ بوئے خوں، رچی بسی
"پر" ہیں آسمان گیر مطمئن

لوٹ آئے گا، جہاں کہیں رہے
باؤلے سے یوں تھی ہیر مطمئن

گھر گیا تھا کس طرح کمان میں
چبھ کے ہو گیا ہے تیر مطمئن

کامیاب اس کا پہلا وار تھا
زخم کھا کے بھی ہے میر مطمئن

ہر غزل پہ فرض کیوں کہ ہو سکیں
اس کے قاری و مدیر مطمئن

پھر کوئی، نئی جہت، نیا جنوں
کب ہے اشہر اسیر مطمئن

شہر میں لوگ تو مل جاتے ہیں، لوکل ریل میں ایسا ہو
ہر اک اسٹیشن پر کوئی روز کا ساتھی ملتا ہو

آٹو رکشا، بسیں، ٹرامیں، ٹیکسیاں مل جاتی ہیں
لیکن وہ ٹم ٹم کی سواری؟ جس کا لطف نرالا ہو

شاخیں ہیں مضبوط ابھی تک، پیڑ وہی شہتوت کا ہے
لوٹ آئے گا بچپن میرا، گر شاخوں پر جھولا ہو

اس جھانکے والے پر بھی تو، اک جذباتی نظم لکھو
دن بھر بوجھ اٹھا کر بھی جو، جیٹھ میں روزہ رکھتا ہو

وقت پہ آجانا ہو شاید، میرے لئے دشوار مگر
تم سے ملنے آؤں گا میں، ملنے کا گر وعدہ ہو

صبح سویرے جاگ اٹھے گا، اس سے یہ امید ہی کیوں
جس کی رات کٹی اُلجھن میں، جو بستر پر جاگا ہو

اشہر ایک تضاد ہے، کیسا، دیکھ لو ہاتھ کے رکشے میں
اک محنت کش رکشا کھینچے، کوئی تن کر بیٹھا ہو

آنکھیں اس کی سُرخ بہت تھیں، آنچل بھی کچھ گیلا تھا
ہونٹوں پر تھا ایک تبسّم لیکن چہرہ پیلا تھا

اس سے مل کر خوش ہو جانا، فطری تھا خوش ہو بیٹھے
لیکن اس کو کھو دینے کی چوٹ سے دل تو نیلا تھا

بول رہا تھا، غصہ، شکوہ، رنج، تکلّف آنکھوں میں
اس کی آنکھوں کے ترکش میں، اک اک تیر نکیلا تھا

چند کلومیٹر کی دوری، دیر میں طے کی، چپ بھی رہے
ٹیکسی والا حیلہ جُو تھا، لیکن ایک وسیلا تھا

اس کی طبیعت کی رنگینی، بالکل پہلے جیسی تھی
بھڑکیلی پوشاک میں تھا پر، باتوں میں شرمیلا تھا

خط سے کبوتر اب بیگانا رہتا ہے
ٹیلی فون کے تار پہ بیٹھا رہتا ہے

جنگ ہوا کرتی ہے اس کی فیصلہ کن
وہ اپنے غصے سے سہما رہتا ہے

کیا جانے کیوں بلب کسی کے کمرے کا
پچھلے پہر تک جلتا بجھتا رہتا ہے

ساتھ نہیں دیتا سایہ دوپہروں میں،
چلنے والا تنہا چلتا رہتا ہے

سڑکی جنگ میں لڑکے مارے جاتے ہیں
اوپر والوں میں سمجھوتہ رہتا ہے

سامنے بیٹھی رہتی ہے وہ ٹی وی کے
پردے پر کیا آنے والا رہتا ہے

بھیڑ میں تنہا رہنا کوئی بات نہیں
وہ تنہائی میں بھی تنہا رہتا ہے

اس کے گھر سے پہلے جیسا ربط نہیں
لیکن اب تک آنا جانا رہتا ہے

اوب گیا ہے کام سے وہ، اشہر لیکن
میز پر کاغذ کالا کرتا رہتا ہے

○

ترا غرور سلامت، مری انا قائم
دلوں میں پھر بھی رہے کوئی رابطہ قائم

سلام اور دعا ہی سے ٹال دیتا ہوں
میں سب سے رکھتا ہوں محفوظ فاصلہ قائم

جو پُل جزیروں کو جاتے تھے کب کے ٹوٹ گرے
رہا کناروں کے کٹنے کا سلسلہ قائم

شکستِ خواب کو برسوں گذر گئے، لیکن
ہے ایک چیخ سی اب تک صدا صدا قائم

اک آدھ دن کیلئے جا کے گھر، کروں اشہر
میں بے وفاؤں سے پھر رشتہ درد کا قائم

بڑے سلیقے سے توڑا ہے سلسلہ اس نے
ملا جو موڑ بدل ڈالا راستہ اس نے

بتا گیا کہ ابھی خام ہے جنوں میرا
دکھا دیا مری وحشت کو آئینہ اس نے

عجیب سحر تھا اس کی فسردہ آنکھوں میں
مری اداسی کو شرمندہ کر دیا اس نے

پس غبار تھا جب تک وہ یاد کرتا تھا
جب آیا میں سرِ منظر، بھلا دیا اس نے

وہ لڑکی گرچہ رہی مجھ سے بے نیاز مگر
سہیلیوں میں کیا میرا تذکرہ اس نے

وہ بے رخی میں توجہ کی اک ادا اشہر
نہ پوچھ مجھ سے کہ پیغام کیا دیا اس نے

جس ایک چیز پر اس کو یقین کامل تھا
اسے قرار دیا میرا واہمہ اس نے

○

گڑے تھے آنکھوں میں بے چہرہ خوف کے خیمے
سفر میں دشت کوئی بے خطر نہیں تھا کہیں

تھا طشتِ لب پہ مرا رازِ اک کھُلا منظر
مری طرح بھی کوئی بے ہُنر نہیں تھا کہیں

شجر شجر کی جبیں جھک رہی تھی مٹی پر
ہوا میں کوئی بھی سینہ سپر نہیں تھا کہیں

پلٹ کے دیکھا تو اک موج موج صحرا تھا
ہمارے پیچھے نشانِ سفر نہیں تھا کہیں

اسیرِ خواب تھے، جاتے کہاں نکل کر وہ
کہ اس طرح کا کوئی اور گھر نہیں تھا کہیں

پھر ربط آسماں دے مجھے اس زمین سے
میں نے جہاں گذارے ہیں موسم حسین سے

اٹھ جائے بے ارادہ اسے دیکھتے ہی ہاتھ
یوں پھوٹ جائے آبِ تعلق جبین سے

وہ چاہتا ہے اس کے سوا، سارے شہر میں
ہوں لوگ نرم، گیلے، ملائم، مہین سے

اس چائے خانے میں بھی نہ بیٹھیں اگر تو ہم
سمجھے نہ جائیں شہر میں گوشہ نشین سے

وحشت میں میں نے اپنی ہی گردن بھنبھوڑ لی
جبڑے کا خون پونچھ لیا آستین سے

○

ہمارے پیش نظر منظر رواں ٹھہرا
ہوا کی زد میں، بگولوں کا آسماں ٹھہرا

سلگ رہی تھی کوئی چیز تہہ میں دریا کی
جو موج موج ابھرتا ہوا دھواں ٹھہرا

پگھلتے جسموں کا اک سیل تھا ڈھلانوں پر
نہ ٹھہرا دشت میں سورج نہ سائباں ٹھہرا

تھا میرے شانوں پہ اک بوجھ سر قلم جو ہوا
مرا وجود ہی عنوانِ داستاں ٹھہرا

○

تھکا ہوا ہوں بہت، ڈر ہے سو نہ جاؤں میں
سیاہ رات کے جنگل میں کھو نہ جاؤں میں

اسی جزیرے پہ کرنا ہے اب قیام اگر
تو پانیوں میں سفینہ ڈبو نہ جاؤں میں

وہ ڈور کٹ چکی، تم سے مرے تعلق کی
اٹھوں میں جانے کو تم روک لو، نہ جاؤں میں

یہ سوچ کر رہا اپنے حصارِ جاں میں قید
تمہاری کھوج میں نکلا تو کھو نہ جاؤں میں

یہ سوچتا ہوں، لہو میرا رائیگاں کیوں ہو
تمہارے دل پہ ہیں جو داغ، دھو نہ جاؤں میں

نظر نہ آتا تھا، محسوس ہی ہوا ہوتا
کہیں بھی ہوتا، کسی روپ میں ملا ہوتا

یہ بوجھ بوجھ سی آنکھیں تو کچھ سبک ہوتیں
پڑاؤ خواب کا پل بھر کو اٹھ گیا ہوتا

تھا ہاتھ ہاتھ میں اتنے قریب آکر بھی
دلوں کے بیچ تھا جو فاصلہ مٹا ہوتا

پلٹ کے آیا تو دروازہ بند تھا اس کا
مجھے تو جانا تھا، آگے چلا گیا ہوتا

○

سرفرازی تھی شان سے خالی
وہ ملا آن بان سے خالی

اتنے اونچے تھے دام خوابوں کے
آنکھیں لوٹیں دکان سے خالی

ہر طرف سے برس رہی ہے دھوپ
دشت ہے سائبان سے خالی

مجھ سے چھوٹا مرا نیستاں کیا
ہو گئی نے بھی تان سے خالی

اک صدا ہیں خطوط چہروں سے
اپنے شرح و بیان سے خالی

کون دیتا کسے اماں اشہر
شہر ہی تھا مکان سے خالی

کوئی ہے، کہیں کا ہے، اگر ہے تو نظر آ
آنکھوں کے مقابل کسی منظر پہ ابھر آ

دن رات یونہی کھینچتا رہتا ہوں لکیریں
کاغذ پہ کسی روز مرے خواب! ابھر آ

اس سے بڑی الجھن ہے یہ، آگ کے طالب
لے میری ہتھیلی پہ ہے اک شعلہ، ادھر آ

پھر پیاس سرابوں کی طلب گار ہوئی ہے
اک ریت کا دریا لئے اے دشت [illegible] سفر آ

بہنے کے لئے کوئی بھی ہوگا نہ میسر
اے چڑھتے ہوئے دریا! سنبھل اور اتر آ

خاموش اندھیروں میں نہ گھٹ جائے مرا دم
[illegible]ئے درخشاں تو کسی [illegible] سے گھر آ

○

ایک جھٹکا لگا، پھسلا سَر سے
بوجھ ہم خوابی کا اترا سَر سے

چیخ، طوفان، ادھڑتے منظر
ہے قیامت کا گذرنا سر سے

اس کا قاتل ہے تحفظ اپنا
پانی ہونے کو تھا اونچا سر سے

ختم ہو جاتا نصابوں کا سفر
بار بچپن کا اترتا سر سے

ایک اک موئے بدن آنکھ ہے اب
پھینک پتھر کوئی ٹکڑا سر سے

ہو گئے دونوں ہی زخمی اکثر
خاک ٹکرایا تھا شیشہ سر سے

○

دل دیا اور دل میں چاہ نہ دی
گُل کو خوشبوئے بے پناہ نہ دی

اب وہی حکمراں ہیں پتھر پر
دل نے جن آہٹوں کو راہ نہ دی

دے دیا سر حسینؓ نے، لیکن
حشمتِ لشکر و سپاہ نہ دی

دوسروں کو پناہ کیا دیتا
جس نے خود کو کبھی پناہ نہ دی

وہ اُجڑ تھا، چلو یہ مان لیا
تم نے ہی اس سے کیوں نباہ نہ دی

ایک کوزے میں کوئی اترا تھا
ایک کوزہ، کہ جس نے تھاہ نہ دی

○

جھاڑی میں پاؤں الجھے ہیں، نیزہ ہوا میں ہے
سو وسوسے ہیں، آخری لمحہ ہوا میں ہے

پانی ہی پانی پھیلا ہے حدِّ نگاہ تک
بے دم پروں کے ساتھ پرندہ ہوا میں ہے

اب دیکھنا ہے جا کے کہاں بیٹھتی ہے دھول
برسوں سے باگ ہاتھ میں، گھوڑا ہوا میں ہے

گر گر کے برف کاٹتی رہتی ہے دھیان کو
گیانی مگر پہاڑ پہ تنہا ہوا میں ہے

اب سانپ سیڑھیوں کی علامت نہیں رہی
چڑھنا ہو یا اترنا اشارہ ہوا میں ہے

کبھی مایوس ہو جانا ، کبھی تم مضمحل ہونا
یہی دنیا سکھا دے گی ، کسی دن مشتعل ہونا

نہ ہو گی آب خنجر میں ، نہ ہو گی تاب سینے میں
مرے زخموں کو آجائے گا ، جس دن مندمل ہونا

کسی کے پھیلنے سے گر ، سکڑتا جاؤں گا یونہی
کسی دن لازمی ہو گا ، یہاں سے منتقل ہونا

کہاں میں دھیان دیتا ہوں کبھی تعریف پر اپنی
مگر بیکار باتوں سے ، تو فطری ہے خجل ہونا

بہت سی مشکلیں اشہر یہاں آسان ہو جائیں
اگر دنیا کو آجائے ، کسی دن میرا دل ہونا

○

مجھے تھی آسماں کی دُھن ، میں خاک پر اُتر گیا
قدم مرے اٹھے کدھر ، کدھر سے میں گذر گیا

وہیں کے پتھروں سے پوچھ ، میرا حالِ زندگی
میں ریزہ ریزہ ہو کے جس دیار میں بکھر گیا

ترا غرور جُھک کے جب ملا مرے وجود سے
نہ جانے میری کمتری کا چہرہ کیوں اتر گیا

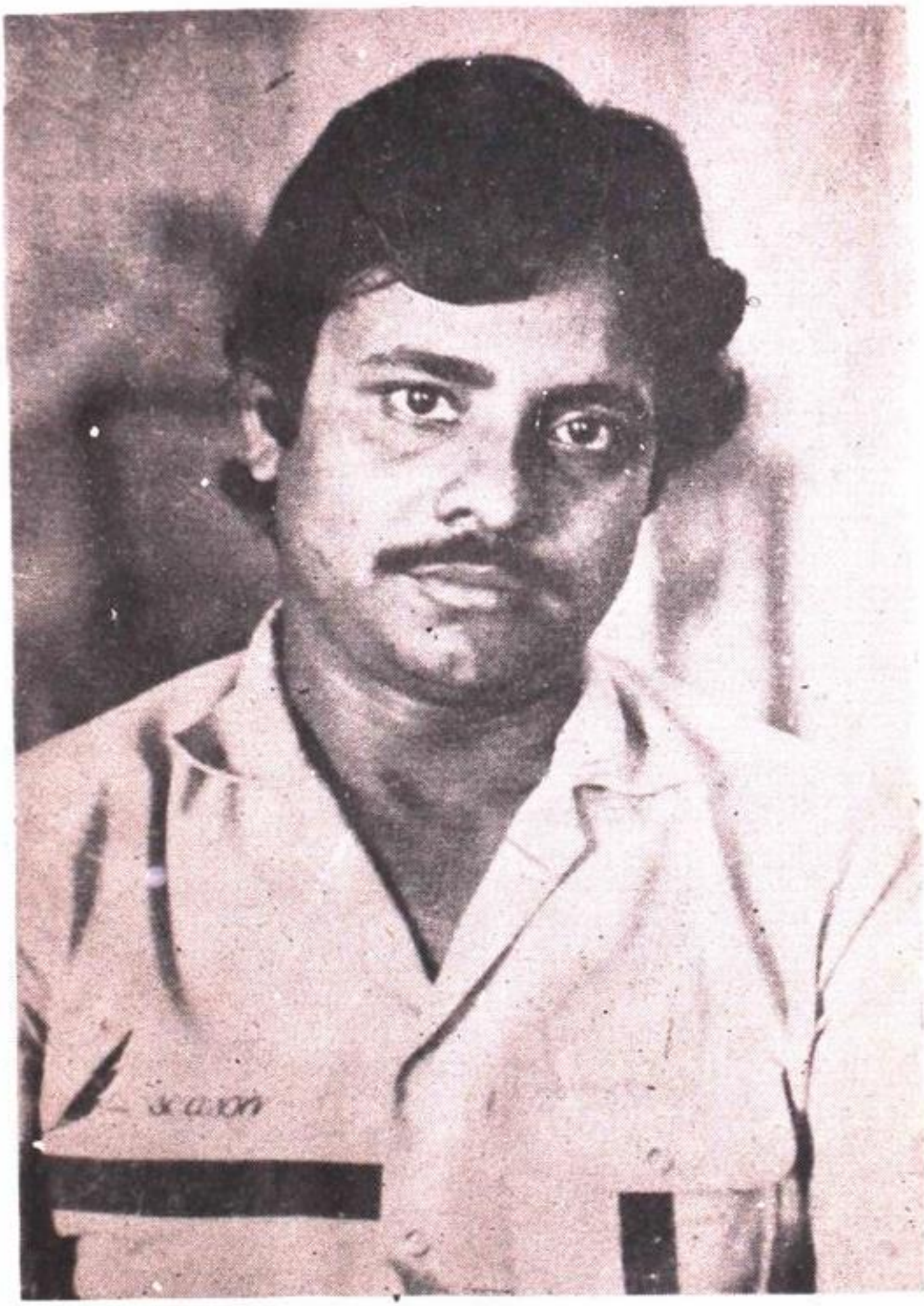

اشہر ہاشمی

۳۱۔ روشن گلزار لین، ہوڑہ، ۷۱۱۱۰۱